غلام محمد جعفر

مولانا عبید اللہ سندھی اور ارباب دارالعلوم' دیوبند

مولانا عبید اللہ سندھی برصغیرپاک و ہند کی ان نامور شخصیات میں سے ایک شخصیت ہیں' جنھوں نے آزادی ہند کی جدوجہد میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ مولانا سندھی ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں چیانوالی میں پیدا ہوئے۔ مولانا کا خاندان زرگری کے پیشہ سے متعلق تھا۔ مولانا اپنے اور خاندان کے بارے میں تحریر کرتے ہیں "میں بہ شب جمعہ قبل صبح ۱۲ محرم ۱۲۸۹ھ بمطابق ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء کو پیدا ہوا۔ میرا باپ چار ماہ پہلے فوت ہوچکا تھا۔ دو سال بعد دادا بھی مرگیا۔ تو میری والدہ مجھے ننھیال میں لے آئی۔ یہ ایک خالص سکھ خاندان تھا۔ میرے نانا کی ترغیب پر ہی میرا والد سکھ بن گیا۔ میرے دو ماموں جام پور ضلع ڈیرہ غازی خان میں پٹواری تھے۔ جب نانا فوت ہوا تو ہم ان کے پاس چلے آئے۔ میری تعلیم ۱۸۷۸ء سے جام پور کے اردو مڈل سکول میں شروع ہوئی۔ ۱۸۸۷ء میں مڈل کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا کہ اظہار اسلام کے لیے گھر چھوڑ دیا۔" (۱)

مولانا سندھی جب سکول پڑھتے تھے۔ تو انہیں آریہ سماج کے ایک لڑکے سے ایک کتاب " تحفتہ الہند" پڑھنے کو ملی۔ اس کتاب کے مطالعے سے مولانا اسلام کی جانب راغب ہوئے۔ تحفتہ الہند کے علاوہ شاہ محمد اسماعیل شہید

کی کتاب "تقویۃ الایمان" اور مولانا محمد صاحب لکھوکی کی کتاب "احوال الاخرت" بھی پڑھنے کو ملی۔ ان کتابوں سے متاثر ہو کر انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد مولانا اپنے ایک دوست محمد رفیق کے ہمراہ جام پور سے نکل کھڑے ہوئے۔ کچھ دن مظفر گڑھ میں کوٹلہ رحیم شاہ میں گزارے۔ اس کے بعد آپ سندھ چلے گئے۔ جہاں حافظ محمد صدیق (بھرچونڈی) کے حلقہ ارادت میں شامل ہوگئے۔ مولانا کو اپنے مرشد حافظ محمد صدیق سے خاص انس و محبت تھی۔ اس وجہ سے مولانا ہمیشہ انہیں اپنا دینی باپ تصور کرتے تھے۔ اور ان ہی کی وجہ سے مولانا نے سندھ کو اپنا مستقل وطن بنا لیا۔ تین چار ماہ بھرچونڈی میں قیام کرنے کے بعد مولانا سندھی دینی تعلیم کے حصول کے لیے وہاں سے کوچ کرتے ہیں۔ بھرچونڈی سے روانہ ہوتے وقت ان کے مرشد حافظ محمد صدیق نے مولانا کے حق میں خصوصی دعا کرتے ہوئے فرمایا۔ "خدا کرے کہ عبیداللہ کا کسی راسخ عالم سے پالا پڑے۔" (۲)

بھرچونڈی سے رخصت ہو کر مولانا نے ریاست بہاولپور کی بعض دیہاتی مساجد میں عربی کی ابتدائی کتب پڑھیں۔ پھر حافظ محمد صدیق کے خلیفہ اول مولانا ابوالسراج غلام محمد کے پاس دین پور چلے گئے۔ مولانا غلام محمد صاحب موضع دین پور' علاقہ خان پور' ریاست بہاولپور کے باشندے اور حافظ محمد صدیق بھرچونڈی کے خلیفہ اول تھے۔ چونکہ وہ مولانا سندھی' کے پیر بھائی اور ان کے پیر و مرشد کے خلیفہ تھے۔ اس لیے آپس میں بہت زیادہ تعلق اور اخلاص تھا۔ مولانا سندھی کابل جاتے وقت اپنی صاحبزادی کو انہیں کی کفالت میں چھوڑ گئے تھے۔ (۳)

دین پور سے آپ ایک بار پھر کوٹلہ رحیم شاہ تشریف لے گئے۔ کچھ عرصہ وہاں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مظفر گڑھ سے ریل میں سوار ہو کر دیوبند پہنچے۔ جہاں دو تین مہینے تک حافظ محمد احمد صاحب سے تعلیم حاصل کی۔

اس کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسن کے درس میں شامل ہوگئے۔ مولانا سندھی نے جامع ترمذی مولانا محمود حسن سے پڑھی اور سنن ابی داؤد پڑھنے کے لیے مولانا رشید احمد گنگوھی کے پاس گنگوہ چلے گئے۔

تکمیل تعلیم کے بعد مولانا سندھی ۲۰ جماعی الثانی ۱۳۰۸ کو واپس بھرچونڈی چلے آئے' لیکن مولانا کی آمد سے قبل ان کے پیر روشن ضمیر حافظ محمد صدیق انتقال فرما چکے تھے۔ آپ بھرچونڈی سے مولانا تاج محمود کے پاس امروٹ آگئے۔ مولانا سندھی خود تحریر فرماتے ہیں۔

> "شوال ۱۳۰۸ھ میں سید العارفین کے دوسرے خلیفہ مولانا ابوحسن تاج محمود کے پاس امروٹ ضلع سکھر چلا گیا۔ انہوں نے اپنے مرشد کا وعدہ پورا کر دکھایا۔ وہ میرے لیے بمنزلہ باپ کے تھے۔ میرا نکاح سکھر کے اسلامیہ سکول کے ماسٹر مولوی محمد عظیم خان یوسف زئی کی لڑکی سے کرایا۔ میری والدہ کو بلایا۔ وہ میرے پاس اخیر وقت تک میرے طرز پر رہیں۔ میرے مطالعہ کے لیے بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا۔ میں ان کے ظل عاطفت میں ۱۳۱۵ھ تک اطمینان سے مطالعہ کرتا رہا۔" (۴)

امروٹ کے علاوہ مولانا سندھی گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدر آباد میں علم کی پیاس بجھانے کے لیے بھی اکثر چلے جاتے۔ مولانا اس سلسلے میں یوں رقمطراز ہیں۔

> "گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدر آباد میں راشدی طریقہ کے پیر صاحب العلم کے پاس علوم دینیہ کا کتب خانہ تھا۔ میں دوران مطالعہ وہاں جاتا رہا۔ اور کتابیں بھی مستعار لاتا رہا۔ میرے تکمیل مطالعہ میں اس کتب خانے کے فیض کا بڑا

دخل تھا۔" (۵) سندھ میں قیام کے دوران مولانا سندھی کا حافظ محمد صدیق کے دونوں خلفاء مولانا تاج محمود اور مولانا غلام محمد سے برابر رابطہ رہا۔ مولانا تحریر کرتے ہیں۔ "اگر میری کوئی دنیاوی ضرورت امروٹ میں پوری نہ ہوتی تو دین پور سے حاصل کر لیتا۔ اس طرح مجھے اپنے مرشد کی جماعت سے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہوئی۔" (۶)

مولانا سندھی ۱۳۱۵ھ میں دوبارہ دارالعلوم دیوبند چلے گئے۔ مولانا سندھی چونکہ سیاسی اور انقلابی ذہن رکھتے تھے۔ اس لیے شیخ الہند مولانا محمود حسن نے انہیں اپنے سیاسی پروگرام میں شریک کار بنا لیا۔ مولانا سندھی اپنے سیاسی میلان کے بارے میں لکھتے ہیں "دوران مطالعہ میں نے مولانا محمد اسماعیل شہید کی سوانح عمری دیکھی۔ اسلامی مطالعہ کی ابتداء سے میرا قلبی تعلق مولانا مرحوم سے پیدا ہو چکا تھا۔ دیوبند کی طالب علمی نے بہت سے واقعات اور حکایات سے آشنا کر دیا تھا۔ مولانا عبدالکریم دیوبندی نے سقوط دہلی کی تاریخ آنکھوں دیکھی بتا دی تھی۔ میرا دماغ بچپن سے خاندانی عورتوں کی صحبت میں انقلاب پنجاب کی تکلیف دہ حالات سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں ایک قسم کا انقلاب آیا۔ پہلے جو کچھ لاہور کے لیے سوچتا تھا۔ اب دہلی کے لیے سوچنے لگا۔ مولانا شہید کے مکتوبات میں سے ایک مضمون لے کر میں نے اپنا سیاسی پروگرام بنایا تھا۔ وہ اسلامی بھی تھا اور انقلابی بھی۔ مگر ہند کے باہر مسلمانوں کی تحریک سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نے حجتہ اللہ پڑھنے والی جماعت کو اس میں شامل کر لیا اور اس طرح اپنے خیال کے موافق آہستہ آہستہ کام کرنا شروع کر دیا۔" (۷)

دیوبند سے واپسی کے بعد آپ امروٹ آ گئے۔ جہاں ایک مطبع قائم کیا۔ جو دو سال تک کام کرتا رہا۔ ۱۳۱۹ھ میں گوٹھ پیر جھنڈا میں مولانا راشد

اللہ صاحب العلم کے ساتھ مل کر ایک مدرسہ دارالرشاد کے نام سے قائم کیا۔ سات سال تک مولانا سندھی اس مدرسہ کے علمی و انتظامی امور میں شریک رہے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا شیخ حسین بن محسن یمانی امتحانات لینے کے سلسلے میں اس مدرسے میں تشریف لائے۔

پہلے سے مولانا سندھی کا رابطہ مولانا محمود حسن سے قائم ہو چکا تھا۔ اور مولانا محمود حسن نے انہیں اپنے سیاسی مشن میں ہم راز بنا لیا تھا۔ اس وجہ سے ۱۳۲۷ھ میں مولانا محمود حسن نے انہیں واپس دیوبند بلایا اور دیوبند ہی میں رہ کر کام کرنے کا حکم دیا۔ یہاں مولانا محمود حسن کے حکم سے ایک تنظیم جمیعتہ الانصار کی بنیاد رکھی گئی۔ اس جمیعتہ الانصار کی تاسیس میں مولانا محمد صادق صاحب، مولانا احمد علی لاہوری بھی مولانا عبید اللہ سندھی کے ساتھ تھے۔

جمیعتہ الانصار کے مقاصد کے بارے میں مرحوم پروفیسر محمد سرور لکھتے ہیں:۔

> "جمیعتہ الانصار کا قیام ۱۹۰۹ء میں عمل میں آیا....
> اس انجمن کا مقصد ملک اور بیرون ملک فضلائے دیوبند کی تنظیم کرنا تھی۔ اس تنظیم کا تعلق ایک بہت بڑی اسکیم سے تھا۔ جس کا حلقہ اثر ہندوستان کے علاوہ افغانستان، ایران، ترکی، بخارا اور عرب وغیرہ تمام اسلامی ممالک سے تھا۔ مولانا سندھی اور حضرت شیخ الہند کی کوششوں سے یہ تنظیم بہت مقبول ہوئی۔" (۸)

پروفیسر موصوف مزید لکھتے ہیں۔

> "جمیعتہ الانصار کی یہ تنظیم اگرچہ بالکل مذہبی تحریک تھی۔ لیکن حضرت شیخ الہند ملک میں ایک صالح اور قابل معاشرہ تیار کر رہے تھے۔ اور اسکو منظم کر رہے تھے۔ اس لیے کہ اگر آئندہ چل کر ہندوستان کے باہر انقلاب لایا

جائے' تو اندرونِ ملک ایک منظّم گروہ ہونا چاہیے۔ جو انقلاب کو کامیاب بنائے۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ ملک کے اندر بکثرت لائق افراد موجود ہوں۔ لیکن افسوس کہ اپنی حکومت کے قیام کا یہ منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔"

(۹)

دارالعلوم' دیوبند کے ارباب اہتمام مولانا عبید اللہ سندھی کے سیاسی افکار اور سرگرمیوں کو دارالعلوم کے لیے نقصان دہ تصور کرتے تھے' اس لیے مولانا سندھی اور ارباب اہتمام کے درمیان اختلاف پیدا ہوگئے۔ چنانچہ چند مذہبی مسائل میں اختلافات کو وجہ بنا کر مولانا سندھی کو دارالعلوم سے الگ کر دیا گیا۔ ان اختلافات کے بارے میں مفتی عزیز الرحمٰن لکھتے ہیں:

"ہوا یوں کہ ارباب اہتمام دارالعلوم دیو بند مولانا سندھی کی ان سرگرمیوں کو اپنے اور دارالعلوم دیوبند کے لیے خطرہ کی گھنٹی سمجھتے تھے۔ اور اس خطرہ کو مول لینے کے لیے ارباب اہتمام کسی طرح تیار نہ تھے۔ اس لیے انھوں نے علامہ سندھی کے خلاف چند مسائل نکال کھڑے کیے۔ تاکہ ان کو دارالعلوم سے یہ کہہ کر نکال دیا جائے' کہ وہ اکابر کے مسلک سے ہٹ گئے ہیں یا گمراہ ہوگئے ہیں۔ یا [illegible]کار و نظریات گمراہ کن ہیں۔ لہٰذا ایسے شخص کا دار[illegible]واری میں رکھنا طلبہ کے لیے مضر ہے۔"

(۱۰)

جس مذہبی مسئلہ پر اختلاف پیدا ہوا' وہ تبلیغ کا مسئلہ تھا۔ مولانا سندھی کے نزدیک مغرب کے غیر مسلم لوگ تبلیغ حق سے پوری طرح آگاہ نہیں' اس لیے اگر ان کے اخلاق اچھے ہیں اور وہ خدا کی وحدانیت پر یقین رکھتے ہیں تو وہ

نجات کے مستحق ہیں۔ مولانا عبداللہ لغاری تبلیغ سے متعلق مولانا سندھی اور ارباب اہتمام کے مابین نزاع کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ایک بار نجات غیر مسلم کے بارے میں مولانا سندھی مولانا انور شاہ صاحب سے گفتگو کر رہے تھے۔ مولانا سندھی نے فرمایا کہ اگر ایک غیر مسلم آدمی جو بااخلاق ہے اللہ کو وحدہ لاشریک مانتا ہے اور لوگوں میں اصلاح کرتا ہے اور اس کے اعمال بھی بھلے ہوں، تو وہ قیامت میں نجات کا مستحق ہے۔ مولانا انور شاہ صاحب نے کہا۔ "کیا آپ کا یہ اعتقاد ہے کہ اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نبی نہ مانے تو وہ بھی نجات کا مستحق ہو سکتا ہے؟" مولانا نے غصے سے کہا "بے شک میں یہی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ تمہاری تبلیغ ان کے کانوں میں نہیں پہنچی۔" اس پر غصے ہو کر انہوں نے مولانا پر کفر کا فتویٰ صادر کیا۔ اور اراکین مدرسہ کو اطلاع کر دی۔ انہوں نے کہا کہ اگر ان کا یہ اعتقاد ہے تو وہ کافر ہیں۔ پھر انہوں نے ایک مجلس میں مولانا سندھی کو بلایا۔ اور ان سے پوچھا کہ آپ نے یہ کہا ہے کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانے اور اس کے اخلاق اچھے ہوں وہ مسلمانوں کی طرح نجات کا مستحق ہے۔ مولانا سندھی نے فرمایا کہ بے شک میں نے یہ کلمہ کہا ہے۔ انہوں نے کہا آپ نے کلمہ کفر زبان سے نکالا ہے۔ آپ پر کفر کا فتویٰ عائد ہوتا ہے۔ اب آپ اس سے توبہ کریں۔ تو یہاں رہیں ورنہ چلے جائیں۔ مولانا سندھی نے فرمایا کہ میں توبہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ پھر انہوں نے

مولانا کو کلمہ اور آیت باللہ پڑھائی اور استغفار اور توبہ کرانے کے بعد کہا اب آپ مسلمان ہیں۔" (۱۱)

صحیح بات یہ ہے کہ ارباب دارالعلوم نے مذہبی اختلاف کا سہارا لے کر مولانا سندھی کو دارالعلوم دیوبند سے الگ کر دیا۔ مولانا سندھی اور شیخ الہند مولانا محمد حسن کی کاوشوں کے نتیجے میں علی گڑھ اور دیوبند کے ارباب حل و عقد ایک دوسرے کے قریب آرہے تھے۔ اور ہر دو اداروں میں انگریز دشمنی کے جذبات ابھر رہے تھے۔ یہ بات دارالعلوم کے ارباب اہتمام' کو ناگوار گزری۔ کیونکہ ان دونوں درسگاہوں کے اصحاب نظم و نسق حکومت کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مولانا حافظ محمد احمد جو دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے' شمس العلماء کا خطاب حکومت وقت سے قبول کرچکے تھے۔ حافظ محمد احمد' مولانا محمد قاسم نانوتوی کے فرزند تھے۔ حافظ صاحب "یو۔ پی حکومت سے خوش گوار تعلقات رکھتے تھے۔ اور مولانا محمود حسن کی سیاسی سرگرمیوں سے حکومت کو آگاہ کرتے رہتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں مولانا محمود حسن ترک رہنماؤں سے مل کر آزادی ہند سے متعلق جو پروگرام بنانا چاہتے تھے۔ حافظ صاحب نے مختلف ذرائع سے اس پروگرام کا سراغ لگا لیا اور اس سے صوبائی گورنر کو آگاہ کر دیا۔ بعد میں حافظ صاحب مرحوم کو "شمس العلماء" کے خطاب سے نوازا گیا۔ جس پر "زمیندار" لاہور نے نوٹ لکھا۔ حافظ صاحب علماء کا ایک وفد لے کر گورنر سے ملے۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور زمیندار کا نوٹ بھی انہیں پیش کیا۔ ان دستاویزات کے پیش نظر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ حافظ صاحب مرحوم کے عہد تک دارالعلوم کے ارباب حل و عقد' حکومت وقت سے خوش گوار تعلقات رکھتے تھے' یوں نظر آتا ہے کہ حافظ صاحب مرحوم اس طریق سے دارالعلوم کو جنگ کے ہنگامی حالات میں حکومت کے عتاب سے بچانا چاہتے تھے۔" (۱۲)

دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام اور انگریزی سرکار کے درمیان

دوستانہ تعلقات کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ گورنر یو۔ پی کو دارالعلوم میں مدعو کیا گیا اور اس کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ جس پر حکومت وقت کا شکریہ ادا کیا گیا کہ حکومت نے حافظ محمد احمد کو شمس العلماء کا خطاب عطا فرما کر علماء کی عزت افزائی فرمائی۔ سپاسنامہ کے الفاظ کچھ یوں تھے۔

"یور آنر کی خدمت میں اور ان کے توسط سے ہندوستان کے حکمران ہز ایکسیلینسی وائسرائے کی خدمت میں مولانا محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم (دیوبند) کو شمس العلماء کا خطاب اور خصوصی سند مرحمت فرمانے پر جو کہ علماء کی عزت افزائی اور شاہی عطایا کی روایت کا نمونہ ہے اور اپنے پرخلوص قلبی جذبات تشکر کا اظہار کرتے ہیں۔ حکومت کے عمل سے یہی ثابت نہیں ہوتا کہ وہ انہی مسلمان لیڈروں اور راہنماؤں کی عزت کرتی ہے جو اس کے اہل ہیں۔ بلکہ آزادی کے دعویداروں کے اس سوال کا جواب بھی فراہم ہو جاتا ہے کہ اعزازات واقعی اہل لوگوں کو دیے جاتے ہیں۔ یہ درست ہے اور حقیقت کو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مادی اور دنیاوی مفادات حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہنا نہ تو ہمارا فطری رجحان ہے اور نہ ہمارے دینی فرائض کا حصہ ہے۔ لیکن خدا کی مرضی کے مطابق ہمارے موجودہ حکمران اگر ہمیں کوئی اعزاز دیں، تو ہم اسے کیوں نہ قبول کریں اور شایان شان طور پر ان کی ستائش کیوں نہ کریں۔ اگر ہم ایسا کریں (یعنی اعزاز کی قدر اور اس پر شکر گزاری کا اظہار نہ کریں) تو خدا معاف کرے گویا، ہم ممنونیت اور شکرگزاری کے اس فرض سے

روگردانی کریں گے۔ جس کی ہمارے پاک مذہب نے ہمیں تعلیم دی ہے۔ اس سے غفلت برت کر ہم حکومت کی نظر میں اور خدا اور رسولؐ کے آگے اور تمام اخلاقی اصولوں کے آگے ذلیل و خوار ہوں گے..... یور آنر اگرچہ آج ہم ایک خاص "احسان و عنایت" کا شکریہ ادا کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ جو صرف مینجر (مہتمم) صاحب ہی پر نہیں بلکہ ہمارے پورے طبقہ پر کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ہمارے پیش نظر دارالعلوم کے لیے آپ کی نوازشیں بھی ہیں۔ جن کا حال مینجر (مہتمم) صاحب وقتاً فوقتاً بتلاتے رہتے ہیں۔ اس نظر کرم کی وجہ سے مسلم پبلک کا دارالعلوم پر اعتماد بحال ہوگا اور اس سے ہماری اس پالیسی کو تقویت ملے گی۔ جس کی تعریف یورپ کے بڑے بڑے آفیسر کرتے رہے ہیں.... ہمارا ایک اور صرف ایک مقصد ہے اور وہ ہے مذہبی آزادی کا تحفظ اور صرف مذہبی آزادی کا تحفظ! اس سے ہٹ کر کسی سیاسی تحریک کو مسترد کرنا یا قبول کرنا ہمارے قائم اور ناقابل تبدیل نظریے کے باہر ہے۔" (۱۳)

سپاسنامہ کے الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ارباب دارالعلوم حکومت برطانیہ سے دوستانہ تعلقات استوار کرچکے تھے۔ جبکہ مولانا سندھی اور مولانا محمود حسن حکومت برطانیہ کے خلاف معاندانہ رویہ رکھتے تھے۔ حکومت کے خلاف سرگرمیوں کی پاداش میں مولانا سندھی کو دارالعلوم دیوبند سے نکلنا پڑا۔ سید اسد مدنی لکھتے ہیں:

"ایک طرف تو شیخ الہند اور ان کے رفقاء ہر طرح کے خطرات کو مول لے کر حکومت برطانیہ سے حق خود

اختیاری اور آزادی ملک کی جنگ لڑ رہے تھے۔ دوسری جانب ارباب اہتمام حکومت سے وفاداری جتانے کے لیے گورنروں کو دعوتیں دے کر ان کی مدح و ستائش میں قصیدے اور ایڈریس پیش کر رہے تھے۔ اور اس کے صلے میں عطایات و خطابات سے نوازے جا رہے تھے اور اس پر دعویٰ یہ ہے کہ انہوں نے (ارباب اہتمام) صرف جنگ آزادی میں حصہ ہی نہیں لیا۔ بلکہ دوسروں کو بھی حصہ دار بنایا۔ آخر ان تاریخی شواہد کے ہوتے ہوئے کون اس نرے دعویٰ کو باور کر سکتا ہے۔" (۱۴)

دارالعلوم کے ارباب اہتمام اپنے دلوں میں برطانوی حکومت کے لیے جو نرم گوشہ رکھتے تھے اور جس کے نتیجہ میں گورنریو۔ پی کو دارالعلوم میں مدعو کیا گیا۔ ممکن ہے کہ انہوں نے مصلحت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر ایسا کیا ہو۔ کیونکہ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں ہندوستان کے حالات کچھ ایسے تھے کہ اگر کھل کر حکومت برطانیہ کی مخالفت کی جاتی، تو اس بات کا قوی اندیشہ تھا کہ حکومت ہند دارالعلوم دیوبند کو نقصان پہنچانے سے دریغ نہیں کرے گی۔ دارالعلوم کا تحفظ اور بقاء ارباب اہتمام کے پیش نظر تھا۔ مولانا سید حسین احمد مدنی بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ارباب اہتمام، دارالعلوم کو انگریزوں سے بچانا چاہتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"دارالعلوم کا بقا اور تحفظ سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات اور اس کے بعد انگریزوں کی پالیسی ان کے سامنے تھی۔ انہوں نے مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگرمیوں کو نہ صرف دارالعلوم دیوبند بلکہ عام مسلمانوں کے لیے بھی خطرناک تصور کیا اور اپنے خیالات کے مطابق

ضروری سمجھا کہ مولانا سندھی کا تعلق اس مرکز سے نہ رہے۔ اس زمانہ میں اتفاق سے چند علمی مسئلوں میں مولانا سندھی اور دارالعلوم کے دوسرے علماء کے درمیان اختلاف پیدا کرا دیا گیا۔ اسی اختلاف کو وجہ قرار دے کر مولانا سندھی کو دارالعلوم سے علیحدہ کر دیا گیا۔..... اسی اختلاف نے اگرچہ دارالعلوم کے اساتذہ' ملازمین اور عام طلبہ کو حضرت سندھی سے بہت بعید کر دیا تھا لیکن حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز سے تعلق میں کوئی فرق نہیں آیا۔ خفیہ آمدورفت جاری رہی۔ رات کی اندھریوں میں دیوبند کے باہر ملاقاتیں ہوتی تھیں اور ضروری باتیں انجام دی جاتی تھیں۔" (۱۵)

مولانا سندھی' شیخ الہند مولانا محمود حسن کی تحریک کے ایک فعال رکن تھے۔ جب ارباب اہتمام نے مولانا سندھی کو دارالعلوم سے علیحدہ کر دیا' تو شیخ الہند نے اس پر خفگی کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ "مولانا شیخ الہند بہت خوش ہوئے اور فرمایا اچھا ہوا کہ تمہیں اس جماعت سے نجات مل گئی۔ پھر فرمایا اب دہلی جاؤ اور وہاں جا کر کام شروع کر دو۔ میں جلد آجاؤں گا مولانا سندھی نے دہلی آکر نظارۃ المعارف القرآنیہ قائم کیا۔" (۱۶) دارالعلوم سے مولانا سندھی الگ ہونے پر مولانا محمود حسن نے ارباب اہتمام دارالعلوم سے کسی قسم کا احتجاج نہیں کیا۔ اور نہ ہی اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ مولانا محمود حسن بھی دارالعلوم دیوبند کے تحفظ اور بقاء کو خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ مولانا غلام رسول مہر تحریر کرتے ہیں:۔

"میرے مطالعے اور غور و فکر کا نچوڑ یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند اپنی عملی زندگی کے آغاز ہی میں ایک نقشہ

عمل تیار کر چکے تھے اور اسے لباس عمل پہنانے کی کوششیں انہوں نے اس وقت شروع کر دی تھیں جب ہندوستان کے اندر سیاسی سرگرمیاں محض برائے نام تھیں۔ ملک کے حالات کسی تیز تحریک کے لیے ہرگز سازگار نہ تھے۔ مسلمانوں پر حیرانی اور افسردگی طاری تھی۔ وہ ثریا سے تحت الثریٰ میں جا گرے تھے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنی کھوئی ہوئی حیثیت حاصل کرنے کے لیے کون سا راستہ اختیار کریں اور کس طریق عمل پر گامزن ہوں۔ ایسے اصحاب بہت کم نظر آتے تھے، جن کے خلوص پر اعتماد کیا جاسکے، اور جو پیش نظر مقاصد کے لیے بے تکلف ہر قسم کی قربانیوں پر آمادہ ہوں۔ پھر حضرت شیخ الہند کے سامنے ایک بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ دارالعلوم دیوبند کو حکومت کے عتاب کا ہدف بننے سے حتی الامکان محفوظ رکھیں۔" (۱۷)

حافظ محمد احمد اور دیگر ارباب اہتمام نے دارالعلوم کے مفاد کو مقدم سمجھتے ہوئے وقتی طور پر حکومت کے ساتھ دوستی اور خیرسگالی کے تعلقات استوار کیے۔ اس صلہ میں حکومت ہند نے حافظ محمد احمد کو شمس العلماء کے خطاب سے نوازا۔ یہ سب کچھ شاید مصلحت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کیا گیا۔ مولانا محمد میاں اپنی کتاب "تحریک شیخ الہند" میں لکھتے ہیں۔ "ہمارا یقین یہی ہے کہ تقسیم کار کے اصول پر جو فرض حضرت مہتمم کے سپرد ہوا تھا۔ اس کا تقاضا یہی تھا کہ سفید فام انگریز پر زیادہ سے زیادہ روغن قاز ملیں جب کہ انگریز کی سراسیمگی حد کو پہنچی ہوئی تھی اور معمولی معمولی شبہ پر سخت سزائیں دی جا رہی تھیں۔ دوسری طرف خود حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ کے مبلغین قبائل یا غستان کو جہاد پر آمادہ کر رہے تھے۔ تو لامحالہ مہتمم صاحبان کو نرم رویہ اختیار کرنا تھا۔ (۱۸)

جب جنگ عظیم اول کا بحرانی دور ختم ہوا۔ تو حافظ محمد احمد اور دیگر ارباب اہتمام دارالعلوم دیوبند نے بھی اپنے رویہ میں تبدیلی پیدا کر لی۔ حافظ محمد احمد نے شمس العلماء کا خطاب واپس کر دیا۔ جب جمعیتہ العلماء ہند کا عام اجلاس دسمبر ۱۹۲۲ء میں گیا میں منعقد ہوا۔ تو اس کی صدارت نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند مولانا حبیب الرحمٰن نے فرمائی۔ اس اجلاس میں مولانا حبیب الرحمٰن نے جو تقریر فرمائی' وہ آپ کے جذبات کی صحیح ترجمان تھی۔ آپ نے کہا:

"کہ صرف قوم نصاریٰ اور ان میں سے بھی یورپ کے نصاریٰ کا مقابلہ اسلام سے دائمی رہا ہے اور اس لیے یہ کہنا کہ اسلام کے اصلی اور حقیقی دشمن عیسائی ہیں' بالکل صحیح ہے۔ اسلام کی چودہ صدیوں پر نظر ڈالی جائے' تو معلوم ہو جائے گا کہ مسلمانوں کو اس عرصہ میں جس قدر لڑائیاں غیر مذہب والوں سے لڑنی پڑی ہیں۔ ان میں زیادہ حصہ مسیحی سلطنتوں کا ہے۔" (۱۹)

جہاں حافظ محمد احمد اور مولانا حبیب الرحمٰن کے رویہ میں تبدیلی آئی۔ وہاں مولانا نور شاہ کشمیری نے بھی اپنے سابقہ رویہ پر مولانا عبید اللہ سندھی کو ایک خط لکھ کر معذرت کر لی۔ مولانا انور شاہ صاحب نے مولانا سندھی کے نام جب ان کا قیام مکہ معظمہ میں تھا۔ پیغام بھیجا تھا کہ قیام دیوبند کے زمانہ میں غلط فہمی کی وجہ سے میں آپ کے لیے تکلیف کا باعث بنا تھا۔ اب میرے دل میں آپ سے کوئی رنج نہیں ہے۔ امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔ (۲۰)

واقعہ یہ ہے کہ اگر دارالعلوم کے ارباب حل و عقد برطانوی حکومت سے دوستانہ تعلقات اور دارالعلوم سے مولانا سندھی کی علیحدگی کو وقتی مصلحتوں کا تقاضا تصور کریں' پھر بھی دارالعلوم کے ارباب اہتمام کا طرز عمل اور فرنگی حکومت کے ساتھ ان کا تعاون مقام عزیمت کے خلاف ہی تصور کیا جائے گا۔

علماء حق نے ہمیشہ وقتی مصلحتوں کو پس پشت ڈال کر عزیمت کی راہ اختیار کی اور استقامت کے ساتھ اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات و مصائب کا سامنا کیا۔

حواشی

۱۔ عبید اللہ سندھی: کابل میں سات سال' لاہور' ۱۹۵۵ء' ص ۹۴ (سندھی ساگر اکادمی)

۲۔ ایضاً' ص ۹۷

۳۔ حسین احمد مدنی: نقش حیات' جلد دوم کراچی سن ندارد' ص ۱۵۔۶۱۴ (دارالاشاعت)

۴۔ عبید اللہ سندھی: کابل میں سات سال' ص ۱۰۰

۵۔ ایضاً۔ ص ۱۰۰

۶۔ ایضاً۔ ص ۱۰۲

۷۔ ایضاً۔ ص ۳۔۱۰۲

۸۔ محمد سرور: افادات و ملفوظات حضرت مولانا عبید اللہ سندھی' لاہور ۱۹۸۷ء' ص ۶۶۔۳۶۵ (سندھ ساگر اکادمی)

۹۔ ایضاً۔ ص ۳۶۶

۱۰۔ ایضاً ص ۶۷۔۳۶۶ بحوالہ تذکرہ شیخ الہند مفتی عزیز الرحمٰن

۱۱۔ عبید اللہ لغاری: مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگذشت کابل' اسلام آباد ۱۹۸۰ء' ص ۷۷ (قومی ادارہ برائے تحقیق و ثقافت)

۱۲۔ رشید احمد جالندھری: برطانوی ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم' دارالعلوم دیوبند' جلد اول اسلام آباد ۱۹۸۹ء' ص ۴۸۔۲۴۷ (نیشنل بک فاؤنڈیشن) بحوالہ شان محمد: ہندوستانی مسلمان' ایک دستاویزی ریکارڈ' ج ۵' ص ۵۱۔۵۴

۱۳۔ ابو سلمان شاہ جہان پوری: مولانا عبید اللہ سندھی کا دارالعلوم دیوبند سے اخراج' الولی جلد ۱۵ شمارہ ۲'۳' ۱۹۹۱ء' ص ۳۲۔۳۰

۱۴۔ سید اسعد مدنی: مولانا عبید اللہ کا دارالعلوم دیوبند سے اخراج اور ارباب اہتمام۔ کل اور آج' الولی جلد ۱۵ شمارہ ۵'۴' ۱۹۹۲ء' ص ۴۰
۱۵۔ حسین احمد مدنی: نقش حیات' جلد دوم' ص ۲۔۵۶۱
۱۶۔ محمد سرور: افادات و ملفوظات حضرت مولانا عبید اللہ سندھی۔ ص ۳۷۵
۱۷۔ غلام رسول مہر: سرگذشت مجاہدین' لاہور ۱۹۵۸ء' ص ۵۲۔۵۵۳
۱۸۔ سید محمد میاں: تحریک شیخ الہند' کراچی (مکتبہ رشیدیہ) ۱۹۸۸ء ص ۱۶۲
۱۹۔ سید محمد میاں: تحریک شیخ الہند' ص ۱۶۳
۲۰۔ حسین احمد مدنی: نقش حیات' جلد دوم' ص ۵۶۱